'اندھیرا پگ': ایک تجزیہ

پروفیسر انور پاشا

جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔110067، موبائل: 9650869211

ناول کا فن دیگر اصنافِ ادب کے مقابلے میں زیادہ ہمہ گیریت اور وسیع تر کینوس کا متقاضی ہوتا ہے۔ بیانیہ کے لحاظ سے بھی اس کے اندر بے پناہ امکانات موجود ہوتے ہیں۔ نیز یہ کہ واقعات کے سپاٹ بیان کے بجائے ایک کامیاب ناول میں بیانیہ کا تانا بانا لطیف اور بلیغ معنویت کا مظہر ہوتا ہے۔ اس میں ماضی، حال اور مستقبل تینوں کے تناظر باہم گُتھے ہوئے ہوتے ہیں۔ گویا ناول تاریخ بھی ہے عصری دستاویز بھی اور آنے والے عصر نو کے خوابوں کی تعبیر بھی۔ چونکہ اس میں انسانی زندگی کی خارجی و باطنی دونوں تہیں موجود ہوتی ہیں جن کی جڑیں ماضی میں پیوست ہونے کے ساتھ ساتھ حال اور مستقبل سے بھی اپنا رشتہ اُستوار رکھتی ہیں۔ اس لیے ناول میں پیش کردہ زندگی اور اس کے مظاہر کو کسی ایک دَور تک محدود و مخصوص نہیں کیا جا سکتا۔ ناول میں پیش کردہ واقعات کا عصری تناظر جہاں اُسے تاریخیت سے قریب تر کرتا ہے وہیں عصری اقدارِ حیات کے وہ روپ بھی اس میں مضمر ہوتے ہیں جو ماورائے عصر ہوتے ہیں۔ یہی صفت اسے معاصر معنویت کے ساتھ آفاقیت اور ابدیت سے ہمکنار کرتی ہے۔

ثروت خاں کے ناول ''اندھیرا پگ'' میں بھی ماضی، حال اور مستقبل کا تناظر بیک وقت کینوس پر ابھرتا ہے۔ ناول راجستھان کے سماجی و تہذیبی تناظر پر مرکوز ہے۔ وہ راجستھان جو ہندوستان کی تاریخ میں اپنی شان و شوکت اور شجاعت و بہادری میں پُر شکوہ رزمیے سے عبارت باب کی حیثیت رکھتا ہے تو دوسری جانب اسی تہذیب و تاریخ کا باطن اور اس کی روح بعض ایسی مذموم روایتوں اور اقدار کی ضَرب سے اتنی لہولہان اور زخم خوردہ رہی ہے کہ ہماری تہذیبی ترقی کے تمام دعوے اس کے آگے شرمسار اور سرنگوں نظر آتے ہیں۔ راجستھان کی اسی متضاد تہذیبی صورتِ حال کو اجاگر کرنے اور اسے فکری و جمالیاتی سطح پر بلیغ معنویت عطا کرنے کی کوشش ناول ''اندھیرا پگ'' میں کی گئی ہے۔ خود بقول مصنفہ:

> ''راجستھان رنگ رنگیلی تہذیب کا مرکز کہلاتا ہے۔ کہ جہاں ایک طرف ''Palace of wheel'' میں آپ کو راجواڑی شان و شوکت میں ڈوبا ہوا عیش پروسا جاتا ہے، وہیں دوسری طرف، اس شان و شوکت کے طفیل میں زندگی کے ''کٹھور دھراتل'' پر رینگتی، سسکتی، رواجوں، وراثتوں کو گلے لگاتی..... سفاک حقیقتوں سے روبَرو ہونے کا بھی موقع ملتا ہے۔ بشرطیکہ اس کے دیہات تک رسائی کی جائے۔ آیئے میرے ساتھ.... اور جھانکئے کچھ ایسے ہی مختلف Shades کے اندرون میں۔''
>
> (ثروت خان، اندھیرا پگ)

اس اقتباس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس ناول کو لکھنے کے پیچھے مصنفہ کا بنیادی مقصد محض اپنے تخلیقی ذوق کی تکمیل یا بیانیہ کی بے سمت وادیوں میں سیر کرنا اور کرانا نہیں ہے۔ بلکہ ان کے اس شعور اور سروکار کا اظہار ہے جس کی بدولت ادب عصری معنویت اور معتبریت سے ہم کنار ہوتا ہے اور فن پارہ تخیل کے حصار کو توڑتے ہوئے حقیقت کے پیکر میں ڈھل کر دستاویزی حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔ مصنفہ اس ناول کی تخلیق کے پیچھے کارفرما محرکات اور اپنے عندیے دونوں کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''زندگی کی تب و تابش میں حقیقتوں کے انکشافات کا بڑا عمل دخل ہوا کرتا ہے۔ وہ حقیقتیں، جو آپ میں ہیجان پیدا کر دیں، وہ حالات، جو آپ میں تلاطم برپا کر دیں، وہ انکشافات، جو احساسات و جذبات کے دھاروں کو سِرے سے موڑ دیں..... تخلیق کا باعث بنتے ہیں۔
>
> اس ناول کو تحریری شکل دینے سے قبل میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا..... جب میں جیسلمیر گئی.....وہاں کے کلچر، تہذیبی اقدار اور ثقافتی نظام سے متاثر ہوئی..... جب میں بیکانیر گئی۔ جب میں جودھپور گئی۔ اِتنا کچھ اِتنے قریب سے دیکھا کہ گویا

ایک ایک کردار، ایک ایک واقعہ، ایک ایک مکالمہ سے میری پہچان ہورہی ہو ملاقات ہورہی ہو، اُن کے رہن سہن، طور طریقے، رسم و رواج، سماجی و تہذیبی اُمور اور ان کے اصول وضوابط کی پاسداری میں کوشاں افراد.....کو اپنے اردگرد دیکھ کر میں حیران رہ گئی.....لگا.....تبدیلی ہے کہاں؟ یہ کس چڑیا کا نام ہے۔ ہم مغالطے میں ہیں کہ ہندوستان اکیسویں صدی میں دنیا کے نقشے پر ایک رہنما بن کر اُبھرنے والا ہے..... ہاں مٹھی بھر روشنی پر ہم اِترا سکتے ہیں.....لیکن سواری تو ہمیں بیل گاڑی کی ہی پسند ہے۔ کھڑکھڑ کرتی، پیاں پیاں چلتی..... رینگتے رینگاتے، دھچکے کھاتے اس سفر کی لگام اب بھی فاشسٹ طاقتوں کے ہاتھ میں ہے.....یہ ایسا مضبوط گڑھ ہے، جسے تسخیر کرنا.....اچھے اچھوں کے بس کا نہیں.....نہ جانے کب سے چلا آتا ہے یہ سیل رواں..... ہندوستانی تہذیب وکلچر کی دُہائی دیتا یہ نظام.....کہ جس کو بدلنے کی سعی کی بھی جائے تو مخالفت میں گھر کا بچہ بچہ بپھر کر ظلمتوں کے گھیرے میں آپ کو اس طرح قید کردے گا کہ آپ بے بسی و بے عملی کے بھنور میں پھنس کر زندگی کو صدیوں پُرانے دَقیانوسی نظام کے ہتھے منڈتے چلے جائیں گے، جہاں آپ کو روشنی دکھائی دے گی، نہ ترقی.....آنے والے کئی سو سال تک اس سراب کو حاصل کرنے کی خواہش میں آپ، اپنے آپ کو صَرف کرتے چلے جائیں گے.....بس یہی ہمارا سماج ہے.....جو کل بھی تھا اور کل بھی رہے گا۔''

(ثروت خان، اندھیرا پگ، ص:۶، ۵)

ناول کے پلاٹ کا تانا بانا اسی مذکورہ تہذیبی تناظر یعنی ''کٹھور دھراتل'' پر رینگتی، سسکتی، رواجوں، وراثتوں کو گلے لگاتی سفاک حقیقتوں سے تیار کیا گیا ہے۔ بیانیے کو راجستھان کے دور دراز علاقے میں واقع چھوٹے سے قصبے ''دیش نوک'' پر مرکوز رکھتے ہوئے مرکزی کردار رُوپ کنور، اس کے والدین رتن سنگھ اور سُبھدرا رانی، روپ کنور کی پھوپھی یا بُوا راج کنور، اس کے دادا، دادی، بشن سنگھ اور ماتیشوری اور علاقے کے سرپنچ ٹھاکر بلدیو سنگھ کے اردگرد بُنا گیا ہے۔

'دیش نوک' جہاں جہالت اور غربت کا بسیرا ہے۔ بالخصوص عورتوں پر تعلیم کا دروازہ بند ہے۔ البتہ قصبے کے دَبنگ پروہتوں نے اپنے موروثی علم یعنی تنتر منتر، کریا کرم کا نڈ کو فروغ دے رکھا ہے۔ ان پُروہتوں اور معاشرے کے بنائے ہزاروں سال پرانی روایتوں اور غیر انسانی رسموں کی دیواریں اتنی اونچی ہیں کہ اُن کی حویلیوں کی اونچی اونچی دیواریں بھی اُن کے سامنے سرنگوں ہیں۔ اُنہی پُروہتوں میں سے ایک پُروہت بشن سنگھ کی پوتی اور رتن سنگھ کی بیٹی رُوپ کُنور ہونہار اور ذہین لڑکی ہے۔ وہ پڑھنا چاہتی ہے۔ اس کا بھائی شہر میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کررہا ہے، روپ کنور کو بھی بے حد شوق اور لگن ہے کہ وہ بھی شہر جائے اور ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرے۔ رتن سنگھ کی بہن یعنی روپ کنور کی بُوا راج کنور جو کہ شہر میں رہتی ہے اور جو ایک روشن فکر وخیال کی حامل خاتون ہے، وہ اپنی بھتیجی کی خواہش کی زبردست حامی ہے۔ وہ اس کی خواہش کی تکمیل کے لیے ہر جتن کرتی ہے، مگر بالآخر موروثی رسم ورواج کا ہتھوڑا روپ کنور کی خواہش اور راج کنور کے جتن کو چکنا چور کردیتا ہے اور ان دونوں کے احتجاج کے باوجود کم عمری میں ہی روپ کنور کی شادی کردی جاتی ہے۔ شادی کے دو مہینے کے اندر ہی روپ کنور بیوہ ہوجاتی ہے اور پھر اُس کے ساتھ شروع ہوتا ہے رنڈاپے سے متعلق ان اذیتوں کا سلسلہ جو ''اندھیرا پگ'' کی رسم کے بعد میکے آکر بھی مسلسل جاری رہتا ہے۔ کچھ دنوں بعد روپ کنور کی پھوپھی راج کنور سے جب روپ کنور کی دردناک حالت دیکھی نہیں جاتی تو وہ زبردستی سب کی مرضی کے خلاف روپ کنور کو اپنے ساتھ شہر لے جاتی ہے اور رازدارانہ طور پر اس کا داخلہ میڈیکل کالج میں کرادیتی ہے، لیکن معاملہ یہاں ختم نہیں ہوتا کیونکہ روپ کنور کے گھر والوں کی تمام تر رازداری کے باوجود جب اس کے ڈکٹری پڑھنے کی خبر 'دیش نوک' میں پھیلتی ہے تو ایک کہرام بپا ہوجاتا ہے اور علاقے کے پنچوں اور سماجی ٹھیکے دار سرپنچ بلدیو سنگھ کو اپنی بالادستی ثابت کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ حویلی میں سبھا بلائی جاتی ہے اور رتن سنگھ کو جرمانے کے ساتھ گاؤں نکالا اور سماج سے باہر نکالنے کی دھمکی دے کر ایک ہفتے کے اندر روپ کنور کو پنچایت میں حاضر کرنے کا حکم سنایا جاتا ہے۔ سماجی خوف و دہشت کا شکار رتن سنگھ بالآخر اپنی بیٹی روپ کنور کو اس کی تمام تر مزاحمتوں کے باوجود زبردستی ڈاکٹری کی تعلیم چھُڑا کر گاؤں لے آتا ہے اور پھر سے وہی کال کوٹھری کی اذیت ناک زندگی گزارنے پر مجبور کردیتا ہے۔

اس درمیان روپ کنور کو خود اپنے باپ داداؤں کے ذریعہ قصبے کی مظلوم اور بے بس عورتوں اور اپنی نوکرانی کو ہوس کا شکار بنانے اور اُنھیں قتل کرکے حویلی کے پیچھے اندھی باوڑی میں دفن کرنے جیسی مذموم حرکتوں کی بھنک ملتی ہے، جس سے اس کے اندر مرد اساس اُس ڈھونگی

معاشرے کی خود ساختہ روایتوں کے خلاف بغاوت کا جذبہ اُبلنے لگتا ہے اور وہ بھرپور مزاحمت کرتی ہوئی خود کو اور گھر کی نوکرانی دھونی کو اس ظلم و جبر والے معاشرتی بندھن سے آزاد کرا لیتی ہے۔ اس نقطے پر پہنچ کر Happy End کے ساتھ ناول کا واقعاتی سلسلہ تکمیل کو پہنچتا ہے۔ گرچہ ناول کی یہ Happy Ending مصنفہ کے اس Apporach پر سوال بھی کھڑا کرتی ہے جس میں مصنفہ نے اس ناول کے آخر میں مسئلے کا حل پیش کر کے اپنی رجائی نفسیات کی تسکین کا سامان بھی ڈھونڈ لیا ہے، لیکن کیا واقعی ہمارے معاشرے میں موجود اس طرح کے مسئلے کا حل ہو چکا ہے۔

مذکورہ واقعاتی خاکے سے یہ بات عیاں ہے کہ ناول کا موضوع جنسی نابرابری، استحصال اور بالخصوص ہزاروں سال سے سماجی و تہذیبی بے رحم رسموں کی صلیب پر چڑھتی آئی بیوہ عورت کی وہ المناک داستان ہے جسے سُن کر ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایسی مذموم اور بے رحم رسمیں جن پر نہ تو علم و جدت کی روشنی قدغن لگانے میں کامیاب ہے اور نہ ہی قانون و عدالت کے محاکے ان کا کچھ بگاڑنے پر قادر۔ شہری و صنعتی ترقی نے خارجی سطح پر گرچہ اس مذموم منظر نامے کو داغ داغ اجالا میں تبدیل کرنے میں قدرے معاونت کی ہے، لیکن ذہنی رویے کی سطح پر آج بھی ہمارے اندرون میں ان رسموں کی سیاہی اتنی شوخ ہے کہ اکیسویں صدی کا کم و بیش دو عشرہ گزرنے کے بعد بھی ہم ان حوالوں سے اپنے باطن کو مکمل طور پر منور کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ آج بھی دنیا کی عظیم عوامی جمہوریہ کے پرشکوہ دار السلطنت دہلی سے چند کلو میٹر کے فاصلے پر کھاپ پنچایتوں کے ذریعہ انسانیت کی دروپدی کا چیر ہرن ہوتے قانون اور انتظامیہ کے ساتھ ساتھ علم و دانش اور سائنس و تکنیک کے اعلیٰ ترین اعزازات سے سرفراز افراد، سماجی کارکنان اور انسانی حقوق کے علمبردار نہ صرف خاموش تماشائی کی طرح دیکھنے پر مجبور ہوتے ہیں بلکہ ٹی۔ وی، ریڈیو اور اخباروں میں ان سے متعلق خبریں دیکھ کر، سُن کر اور پڑھ کر چند لمحوں کے لیے اظہارِ تاسف اور گرما گرم مباحثے یعنی زبانی جمع خرچ کی رسم ادا کر کے اپنے معمولاتِ زندگی میں یوں مصروف ہو جاتے ہیں جیسے کہیں کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

آج بھی بیوہ عورت کے لیے ایسے معاشرے میں وسیع تر سطح پر دو ہی متبادل ہیں۔ یا تو وہ شوہر کی چتا کے ساتھ جل کر ستی ہو جائے یا پھر زندگی کی تمام تر سہولتوں، مسرتوں، امنگوں اور آرزوؤں سے محرومی کی صلیب پر ٹنگی ایک چلتی پھرتی لاش کی طرح زندگی گزارنے پر اکتفا کر لے۔ ایسا بھی نہیں کہ یہ رویہ ملک و معاشرے کے ایک مخصوص خطے تک ہی محدود و محیط ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ خواتین اور بیواؤں کے متعلق یہ رویہ کم و بیش ملک کے ہر خطے اور گوشے میں موجود ہے۔ اس ناول میں مصنفہ نے راجستھان کو حوالہ اس لیے بنایا ہے کہ اول تو یہ کہ راجستھان سے تعلق رکھنے کے سبب اس خطے کے حوالے سے ان کا تجربہ و مشاہدہ زیادہ عمیق ہے۔ دوسرے یہ کہ راجستھان راجپوتانہ شان و شوکت، حویلیوں، قلعوں اور محلوں کا دیش ہونے کے ساتھ ساتھ جنسی تفریق و نابرابری کے رویے، ستی کی روایت اور بیوہ عورت کی زندگی کو جہنم زار بنانے کے سلسلے میں آج بھی قومی سطح پر امتیازی مقام رکھنے والا خطہ ہے۔ جہاں قلعوں، محلوں اور اونچی حویلیوں کی ظاہری چکا چوند ھ اور شان و شوکت کے پیچھے کال کوٹھری، مدفن اور ایذا رسانی کے نشانات قائم و دائم ہیں۔ لہٰذا اس موضوع کی پیش کش کے لیے راجستھانی معاشرے سے زیادہ موزوں معاشرہ کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا تھا۔ مصنفہ نے اس معاشرے کی قلعی کھولنے اور اس کی تہہ در تہہ پرتوں کو نمایاں کرنے میں عمدہ فنکاری کا ثبوت دیا ہے۔ مصنفہ کا بیانیہ قاری کو اس فضا کا ایک ایسا حصہ بنا دیتا ہے جہاں اُس کی خفتہ حسیت بیدار ہو اُٹھتی ہے اور یہی اس ناول کی کامیابی ہے۔ تخلیقیت اور Crafting اس ناول کے تاثر میں اضافہ کرتی ہے۔

واقعات کی کڑیوں کو مربوط کرنے میں مصنفہ نے جس مہارت کا ثبوت دیا ہے وہ قابل تحسین ہے۔ راجستھانی تہذیب و ثقافت کی تہوں کو نمایاں کرنے میں خود ان کی تانیثی فکر و شعور نے بھی موزونیت پیدا کی ہے۔ بلکہ تانیثی فکر و شعور ناول کے بیانیے میں نمک اور آٹے کی طرح باہم گندھے ہوئے ہیں۔ مصنفہ کا تانیثی تیور ناول کے ابتدائی حصے میں ہی روپ کنور کے اس مکالمے سے نمایاں ہو جاتا ہے جب وہ اپنے باپ کے رویے پر ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے مخاطب ہوتی ہے:

> ''میں پوچھتی ہوں باپو، آخر کب تک ہم اس سسٹم کی بھینٹ چڑھتی رہیں گی؟.....ذہن، مشن، وژن سب کا ناش کرنے والا.....'' جیو کی مرتیو تو یہیں ہو جاتی ہے باپو، ہاڑ مانس کے لوتھڑے کو منوشیہ نہیں کہتے۔ نہیں باپو.....میں لوتھڑا نہیں بننا چاہتی۔ مجھے ادھیکار چاہئیں۔ آپ نے تو شاستر پڑھے ہیں، کیا آپ نہیں جانتے.....کیا سماج نہیں جانتا، خود شاستروں کی رچنا استری نے کی ہے۔ پھر ہماری کرنی ماتا بھی تو استری ہی تھیں۔ باپو میں اِستری کی اُسی کھوئی ہوئی اَستِتھی کی تلاش میں

ہوں۔'' (ص:۱۵)

مصنفہ کا یہ تیور پورے ناول کی فضا پر چھایا رہتا ہے اور اختتامیے کے اس جملے پر آ کر تکمیل کو پہنچتا ہے:

''سُبھدرا کو نہ تو اپنے کانوں پر یقین آیا، نہ آنکھوں پر.....اور بے ساختہ اُن کے ہاتھ جاتی ہوئی روپ کنور کو آشیرواد دینے کے لیے آسمان کی جانب اُٹھ گئے.....وہاں تارے جگمگا رہے تھے اور روپی شہر جانے والی سڑک پر دھونی کا ہاتھ تھامے آگے بڑھ رہی تھی۔ آج اَماوشیہ کی اندھیری رات نہیں تھی بلکہ پورنما کا چمکتا چاند اپنی مکمل آب و تاب کے ساتھ دَمک رہا تھا، تاروں نے فضا میں خماری پیدا کر دی تھی۔ روپ کنور اُنھیں چاند ستاروں کی رہنمائی میں اُجیارے پگ کی طرف بڑھتی چلی جا رہی تھی.....'' (ص:۱۵۵)

ناول کو پڑھتے وقت قاری کے ذہن میں تقریباً ڈیڑھ دو عشرہ قبل راجستھان کے ہی ایک گاؤں میں روپ کنور نام کی عورت کے ستی ہونے کے واقعہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور 'اندھیرا پگ' کی روپ کنور کی ساس کے یہ جملے اُس یاد کو مزید مہمیز کرنے کا کام کرتے ہیں۔ ملاحظہ کریں یہ اقتباس:

''بہو کو پھر سے کوٹھری کی طرف دھکیلتے ہوئے بڑبڑانے لگیں.... یہ اسی کوٹھری میں رہے گی۔ بھلا یہ کس کھیت کی مولی ہے۔ میری دادی ساس بھی یہیں رہیں۔ ساسو جی کا ٹھور تھی یہی تھا، پھر اس میں کون سے سُرخاب کے پر لگے ہیں۔ صدیوں سے ہمارے پُرکھے یہ سب کرتے چلے آ رہے ہیں۔ پھر اس رانڈ کے ساتھ ہم بھی تو اپنے کرموں کو بھوگ رہے ہیں.....آتے ہی ڈائن دو ہی مہینے میں میرے بیٹے کو کھا گئی۔ اب اور کھانے کو کیا بچا ہے۔ ابھاگن سے کہا تھا، ستی ہو جا، نشہ کر کے بیٹھ جاتی چِتا میں..... پتہ بھی نہیں چلتا.....ایک ہی بار میں پاپ سے چھوٹ جاتی.....سیدھے سُورگ ملتا.....نہیں مانی.....ہٹ دھرمی.....اب تِل تِل کر مرتی رہ سارا جیون۔'' (ص:۵۰)

ستی روپ کنور اور اندھیرا پگ کی اس روپ کنور میں اتنا فرق ہے کہ ستی روپ کنور اپنے شوہر کی چِتا پر جلا دی گئی تھی اور جسے ستی ماتا اور دیوی کے خطاب سے نوازا گیا تھا جب کہ اندھیرے پگ کی روپ کنور معاشرے کے ظالم ہاتھوں جبراً ستی کی صلیب پر چڑھنے سے انکار کر دیتی ہے اور قدم قدم پر احتجاج و بغاوت کا اظہار کر کے معاشرے کو چیلنج کرتی ہے۔ روپ کنور کا یہ احتجاج اور بغاوت مصنفہ کے اس فکری رویے اور تانیثی شعور کا مظہر ہے جس کی ترجمانی ناول کے آغاز میں درج فارسی کے اس شعر سے ہوتی ہے:

بلبل بنال و نالۂ پُرسوز و ساز کن
در فکرِ آں مباش کہ نہ شنید یا شنید

آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ناول تانیثی فکر اور راجستھانی تہذیب و ثقافت کی ترجمانی دونوں ہی لحاظ سے اردو کے افسانوی ادب میں ایک اضافہ ہے۔ ناول میں جا بجا راجستھانی تہذیب کے خوبصورت مرقعے موجود ہیں جو ان قارئین کے مشاہدے اور علم میں اضافہ کرتے ہیں جو اس خطے کی تہذیبی فضا سے زیادہ مانوس نہیں۔ راجستھانی زبان کی چاشنی اکثر جگہوں پر مکالمے کی شکل میں نمایاں ہوتی ہے اور معاشرتی پس منظر کو آشکارا کرنے اور قاری کو اس فضا سے باندھنے میں معاون ہوتی ہے۔ یہ مکالمے ناول کی فضا کو ابھارنے کے ساتھ ساتھ اس میں علاقائیت کا رنگ بھرنے میں بھی مفید ثابت ہوتے ہیں۔ کرداروں کی تراش خراش میں بھی مصنفہ نے اپنی ہنرمندی کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہ ناول ایک دستاویزی مرقع ہونے کے ساتھ ساتھ سائنسی و تکنیکی ترقی کے اس دور میں ہمارے تہذیبی و ثقافتی وقار کے چہرے کی ظاہری چمک دمک اور نمائشی قلعی کے پیچھے چھپے اُس بدنما داغ کو بھی نمایاں کرتا ہے جو ہمارے تہذیبی تشخص کا آج بھی اُسی طرح حصہ ہے جس طرح ہزاروں سال پہلے تھا۔ لہٰذا مصنفہ کا یہ قول ہماری قومی حمیت کے لیے یقیناً ایک تازیانہ ہے:

''.....تبدیلی ہے کہاں؟ یہ کس چڑیا کا نام ہے؟.....آنے والے کئی سو سال تک اس سراب کو حاصل کرنے کی خواہش میں آپ، اپنے آپ کو صَرف کرتے چلے جائیں گے.....بس یہی ہمارا سماج ہے.....جو کل بھی تھا اور کل بھی رہے گا۔''

مجموعی طور پر ناول 'اندھیرا پگ' اردو کی عام موضوعاتی روایت سے ہٹ کر ایک نئے افق کا پتہ دیتا ہے۔ ناول میں بیانیہ کا انداز قاری کو نہ صرف گرفت میں لیتا ہے بلکہ اس کی ذہنی تطہیر کا کام انجام بھی دیتا ہے۔ اردو میں تانیثی نقطۂ نظر سے لکھے جانے والے ناولوں میں یقیناً یہ ناول ایک تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح قاری کی جمالیاتی حس کے دریچے کو وا کرتا ہے بلکہ اسے سنجیدہ ڈسکورس کے لیے آمادہ بھی کرتا ہے۔

○○